جلد سوم

خاص نمبر

1857

36

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

مجلس مشاورت:

- [illegible] احمد
- [illegible] احمد
- [illegible] سہگل
- [illegible]

تقسیم کار:

سانجھ
Sanjh Publications

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ،
17/31 ٹمپل روڈ، لاہور
فون: 042-7355323
e-mail: sanjhpk@yahoo.com

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 042-6665997

ای میل: mubarakali21@yahoo.com

قیمت فی شمارہ غیر مجلد: 130 روپے

قیمت فی شمارہ مجلد: 180 روپے

سرورق: عباس

پرنٹر: شرکت پریس

تاریخ اشاعت: اپریل 2008ء

فہرست

1857 کی تاریخ نویسی: ایک اجمالی جائزہ	ہما غفار	5
1857 کی جنگ آزادی۔ چند نظری پہلو	ڈاکٹر سید جعفر احمد	24
انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی صورتِ حال	اشفاق سلیم مرزا	40
ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی اور مارکس	محمد ابوالفضل	47
1857: پاکستان کی درسی کتب میں	روبینہ سہگل	57
ایک تہذیب کی موت	ڈاکٹر مبارک علی	101
1857 کی جنگِ آزادی اور پنجاب	احمد سلیم	108
۱۸۵۷ کی عظیم بغاوت: کچھ افسردہ حقائق	گربچن چندن	129
۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت	محمد حسن	149
اردو ادب: جنگ آزادی 1857 کے سیاق میں	نریش ندیم	164
غالبؔ اور غدر	مسعود حسن شہابؔ	174
مولوی علاء الدین	سید داؤد اشرف	189

مولوی لیاقت علی	لئیق رضوی	195
طرّہ باز خاں	سید امتیاز الدین	201
شہزادہ فیروز شاہ	لطیف حسین ادیب	205
فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء	شاہد حسین خاں	211

خصوصی مقالہ

نوآبادیاتی ہندوستان میں جنگ، ہجرت اور بیگانگی: مظفر احمد کی تشکیل نو	سوچے تا چٹوپادھیا ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	214

۱۸۵۷ء کی تاریخ نویسی: ایک اجمالی جائزہ

ہما غفار

اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے اس سال ہونے والی برصغیر کی لوگوں کی بغاوت کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعماری ہتھکنڈوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف شدید احتجاج اور جدوجہد آزادی کی ابتدائی علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بغاوت ۱۰ مئی کو میرٹھ کے فوجی کیمپ میں ان نئے کارتوسوں کے فوج میں متعارف ہونے پر شروع ہوئی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان پر گائے یا سور کی چربی چڑھائی گئی ہے۔ یہ چیز مذہبی حوالے سے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ جو بغاوت فوجی کیمپ سے شروع ہوئی وہ جلد ہی برصغیر کے بڑے علاقے میں پھیل گئی اور مختلف حلقے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کی بناء پر باغیوں کے گروہ میں شامل ہوتے گئے۔ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں ۱۹۵۷ء کی بغاوت بہرحال ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعماری ہتھکنڈوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف شدید احتجاج تھی اس کو اگرچہ سپاہیوں کی بغاوت یا غدر کا نام دیا گیا لیکن برصغیر کے لوگوں کے لیے وہ جدوجہد آزادی کا ایک نشان بن گئی۔ آج جبکہ اسے گزرے ہوئے ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے اس سے متعلق بنیادی مآخذ کی دریافت واستفادہ کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ساتھ ہی نئے نظریات کی روشنی میں واقعات اور ان کے اسباب وعوامل، بغاوت کے مراکز کی علاقائی نوعیت اور جنگ میں مختلف شخصیات وطبقات اور گروہوں کے کردار کا تجزیہ نئے سرے سے کیا جارہا ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حالات وواقعات اور اسباب وعوامل پر لکھنے کا سلسلہ بغاوت

کے ظہور کے ابتدائی سال میں ہی شروع ہوگیا تھا جو کہ پمفلٹ ، ذاتی ڈائریوں، یادداشتوں، خطوط، پارلیمانی ریکارڈ، سرکاری دستاویزات، اخبارات اور کتابوں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اس تاریخی ادب میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا اور نئے حوالوں سے تحقیق کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جس کے نتیجے میں برطانوی استعماریت کے خلاف برصغیر کے لوگوں کی جدوجہد کے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔ اس مقالہ میں اس وسیع تاریخی ادب سے تاریخ نویسی کے نمائندہ رجحانات کو جاننے کے لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر خصوصیت سے لکھی جانے والی کتابوں سے انتخاب کیا گیا ہے۔ اگرچہ کہ اس بغاوت پر نہ صرف علیحدہ سے مقالات اور کتب لکھی گئیں بلکہ برصغیر کی جدید تاریخ پر لکھی گئی کتابوں میں اسے اہم ذیلی موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے متعلق جو اولین تاریخی مواد و ادب سامنے آیا اس کی نوعیت فوری ردعمل کی تھی۔ اس کے لکھنے والے زیادہ تر انگریز فوجی، منتظمین اور وہ انگریز شہری تھے جو بغاوت کی تباہ کاریوں سے براہ راست متاثر ہوئے۔ تاہم ان میں ایک محدود طبقہ ان مقامی لوگوں کا بھی تھا جنہوں نے اپنے افسران کی ایما پر یا پھر ان کی خوشنودی کے لیے یا پھر ذاتی دلچسپی کے باعث ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر قلم اٹھایا۔ اس ادب کے خصوصیت سے دو پہلو تھے، ایک حالات و واقعات کا محققانہ جائزہ کے بجائے یک رخی تصویر پیش کرتا ہے اور ان میں انگریز نسلی برتری کا تصور نمایاں ہے ان تحریروں میں کہیں ہندوستانی باغیوں کے انگریزوں پر ظلم وستم کو مبالغہ آمیزی سے بیان کیا گیا ہے تو کہیں انگریز فوج کی کاروائیوں اور بغاوت کے خاتمے کے لیے کیے گئے انتہا پسندانہ اقدامات کو بڑھا چڑھا کر فخر سے کہ ان کے مطابق اس ناروا سلوک کے ہندوستانی وحشی اور بدمعاش حقدار تھے۔ اول الذکر کے مطالعہ سے برطانوی عوام میں برصغیر کے لوگوں کے بارے میں غم وغصہ، نفرت اور بدلہ کا احساس ابھرا اور موخر الذکر سے اپنی طاقت وقوت کا۔ تاہم چند انگریز فوجی اور منتظمین ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی قوم کی زیادتیوں کو بھی قلمبند کیا اور اس پر تاسف کا اظہار بھی۔

دوسرا پہلو عکاسی کر رہا تھا اس تناؤ کی جو برطانوی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں پایا جارہا تھا اور نظریاتی رجحانات کی جو برطانوی طریقہ سیاست اور انتظامی حکمت عملی پر اثر انداز ہورہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تمام تر نسلی برتری کے رویہ کے ساتھ انہوں نے مقامی لوگوں کو

تنقید کا نشانہ بنایا وہیں بغاوت کے اسباب کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی اس ضمن میں مختلف حلقوں نے ایک دوسرے کی پالیسیوں کو موردالزام بھی ٹھہرایا۔ فوری طور پر جو پمفلٹ سامنے آئے ان میں لکھنے والوں کے اپنے مخصوص کلیہ تھے۔ فوج سے متعلقہ اشخاص نے بنگال رجیمنٹ میں پائی جانے والی کمزوریوں کو بنیاد بنایا جبکہ بنگال کے افسر کی رائے بمبئی کے افسر کی آراء سے مختلف تھی۔ انگلیلی (Evangelical) مذہبی حلقہ نے حکومت کے لادینی کردار کو بنیاد بناتے ہوئے بغاوت کی تباہ کاریوں کو خدا کا عذاب قرار دیا۔ کچھ نے حکومت کے حد سے بڑھتے کمرشل ازم کو جبکہ سیاستدانوں نے اس کا سبب حکومت کے Ultra Radical اقدامات کو قرار دیا۔[1] ایرک اسٹوکس (Eric Stokes) اس ضمن میں دو اور عوامل کی نشاندہی کرتا ہے ایک یہ کہ شہری منتظمین نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ذمہ داری فوجی انتظامیہ کی نااہلی پر ڈالی دوسرے یہ کہ کلکتہ کی یورپی مارکنٹائل برادری نے اس کا ذمہ دار وائسرے لارڈ کیننگ (Lord Canning) اور ان کے افسران کو ٹھہرایا جو اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے کہ ایک تباہ کن شہری بغاوت ان کے بہت قریب ہے۔[2] ۱۸۵۸ء میں جس پمفلٹ نے بغاوت کے عوامل پر روشنی ڈالی اور جسے اس وقت بہت مقبولیت حاصل ہوئی وہ Red Pamphlet ہے جسے The Mutiny of the Bengal Army کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ پمفلٹ بغاوت پر لکھی جانے والے کتابوں کے مصنف جی بی میلسن (G.B. Malleson) نے فرض نام سے لکھا تھا۔ اس میں وائسرائے لارڈ کیننگ اور سابق وائسرے ڈلہوزی (Dalhausie) اور ان کے مشیروں پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حالات و واقعات کو محفوظ کرنے اس کا عمومی جائزہ لینے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین پیش پیش تھے جن میں سب سے نمایاں حیثیت کی حامل دو شخصیات تھیں ایک جون ولیم کے (John William Kaye) اور جی بی میلسن۔ انہوں نے سرکاری دستاویزات کا مدد سے بہت تفصیل سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حالات و واقعات کو علاقہ تا علاقہ بیان کیا اور اسباب و نتائج پر تنقیدی روشنی ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے جون کے کی کتاب The Sepoy War in India 1857-58 History of the (۱۸۷۰-۷۶) تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح میلسن کی کتاب بھی تین جلدوں میں History of the Indian

Mutiny 1857-58(۱۸۸۶ـ۷۹ء) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ میلسن کا ایک اہم کام جون کے، کے جمع کردہ مواد کو مرتب کر کے چھ جلدوں میں شائع کرنا ہے یہ کتاب The History of Indian Mutiny (۱۸۸۰ـ۱۸۹۷ء) ہے۔ اسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر ایک مستند تاریخی کام سمجھا جاتا ہے۔ تاہم جون کے، کے یہاں نسل پرستانہ اور انگریزوں کی برتری کا تصور نظر آتا ہے۔ وہ واضح طور پر کہتا ہے کہ کوئی بھی بہادری کے کارناموں کو بیان کر کے اتنی خوشی محسوس نہیں کر سکتا جتنا کہ ان کتابوں کا لکھنے والا مصنف (جون کے)۔[۳] تاہم یاد رہے کہ جون کے اور میلسن دونوں کننگ اور دیگر برطانوی منتظمین کی پالیسیوں کو برصغیر کے لوگوں میں پیدا ہونے والی بے چینی اور عدم اطمینان کا باعث سمجھتے تھے یہاں تک کہ جون کے کے یہاں اس ضمن میں کاشتکاروں کے مسائل اور بغاوت میں ان کے کردار کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔ ایک اور انگریز مورخ ٹی آر ہولمز (T.R. Holmes) نے اپنی کتاب Hitory of the Indian Mutiny(۱۸۸۳ء) میں یہ واضح کرنا چاہا کہ سپاہیوں کی بغاوت کو تعلقہ دار، زمیندار، گوجر اور ہندوستانی بدمعاشوں (ہولمز کے الفاظ میں) نے حکومت کی کمزوری پر محمول کیا اور وہ جگہ جگہ حکومت وقت کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کا مقصد صرف ذاتی مفادات کا حصول تھا۔

جہاں انگریز مصنفین کی تحریروں میں ۱۸۵۷ء کے باغیوں پر کڑی تنقید نظر آتی ہے اور انہیں جابر، ظالم اور لٹیروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے وہاں چند مستثنیات بھی ہیں جس میں سب سے نمایاں مثال ایڈورڈ تھامسن (Edward Thompson) کی کتاب The Other Side of the Medal(۱۹۲۵ء) ہے۔ اس نے انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں اور پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ لکھتا ہے:

> لیکن افسوس ہے کہ اس پردہ پوشی میں بھی معاندانہ رنگ اختیار کیا گیا یعنی انگریز مورخین نے اپنی قوم کی سیاہ کاریاں چھپانے میں تو پوری سرگرمی کا اظہار کیا مگر دوسری طرف ہندوستانی زیادتیوں کی خوب دل کھول کر تشہیر کی۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ان مستور اور پوشیدہ واقعات کے رخ سے نقاب الٹ کر ایک فیصلہ کن نظر ڈالیں تا کہ دنیا کے سامنے اس واقع کا دوسرا رخ پیش کیا جا سکے۔ نیز غم و غصہ کی اس آگ کا اندازہ

کیا جاسکے جو اس وقت تک ہندوستانی سینوں میں ہمارے خلاف سلگ رہی ہے۔[۴]

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر فوری طور پر برصغیر کے لوگوں کی بھی فارسی اور اردو میں لکھے گئے روزنامچہ، یادداشتیں اور کتابیں وغیرہ سامنے آئیں چونکہ اس وقت انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانا ایک مشکل امر تھا اس لیے ایسی ہی تحریریں سامنے آئیں جو یا تو صرف حالات و واقعات کا اندراج ہیں یا پھر برطانوی افسران کی ایماء پر لکھی گئیں، یا ان میں مدافعانہ انداز تھا اور اپنی وفاداری ثابت کرتے ہوئے مقامی آبادی پر سے بغاوت کے الزام کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم بیں السطور میں ان تکالیف اور مشکلات کی صورت واضح ہو جاتی ہے جو مقامی آبادی کو جھیلنا پڑیں۔ ان کتابوں میں حکیم احسان اللہ خان کی یادداشتیں، ظہیر دہلوی کی داستان غدر جسے اکثر مورخین کے یہاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جیون لال کا روزنامچہ، معین الدین احسن خان کی یادداشتیں،[۵] کنہیالال کا محاربہ اعظم، ذکاءاللہ خان کی تاریخ عروج، عہدِ سلطنت انگلیشہ (۱۹۰۴ء)، سرسید احمد خان کی 'اسباب سرکشی ہند' (۱۸۵۹ء) An Account of the loyal Muhammadans of India (۱۸۶۰ء) ہیں۔ یہاں ہم خصوصیت سے سرسید کی متعلقہ کتابوں کا ذکر کریں گے۔ 'اسباب سرکشی ہند' میں ان عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے جو ہندوستانیوں کی بغاوت یا سرکشی کا باعث ہوئے۔ سرسید نے خاص طور سے مسلمانوں کے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ بجا طور پر ان کی اسباب کی تشخیص بڑی حد تک درست ہے لیکن انداز استعماری رویہ اور اقدامات پر تنقید سے زیادہ مدافعانہ ہے یاد رہے کہ سرسید کی تنقید ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کے تناظر میں تھی وہ برطانوی بادشاہت یا اس کی برصغیر پر حکومت کے ناقد نہیں تھے اور انگریزوں کی سیاسی، ثقافتی اور علمی ترقی و برتری کے کھلے دل سے معترف تھے۔ An Account of the Loyal Muhammadans of India میں سرسید نے مسلمان جاگیرداروں، نوابوں پر سے باغی ہونے کے عمومی الزام کو دھونے کی کوشش کی ہے اور مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ کہاں کہاں انہوں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر انگریزوں سے حق وفاداری ادا کیا۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لیے غدر اور سرکشی کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس میں حصہ لینے والوں کا ذکر وہ منفی الفاظ میں کرتے ہیں جیسا کہ جاہل، بدمعاش،

واہی مولوی، نمک حرام، شراب خور، تماش بین وغیرہ یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر کے لے کہا کہ بے وقت بادشاہ اور مالیخولیا والا آدمی۔[6]

ایک ایسے وقت میں جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اٹھنے والی آوازوں میں یا تو استعماری رویہ اور نسلی برتری اور خود پسندی کا رجحان غالب تھا یا پھر مقامی لوگوں کی جانب سے شکست خوردگی اور مایوسی کا، اس وقت کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی آواز ایسی تھی جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعماری ہتھکنڈوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جولائی ۱۸۵۳ء، نیویارک ڈیلی ٹریبیون میں مارکس اشارہ کرتا ہے کہ:

> جب بورژوا تہذیب اپنے وطن سے جہاں وہ معزز شکلیں اختیار کرتی ہے، نوآبادیات کی طرف بڑھتی ہے، جہاں وہ بالکل عریاں ہو جاتی ہے، تو اس کی گہری ریاکاری اور بربریت جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔[7]

اس روزنامہ میں ایک اور مضمون میں وہ برطانوی منتظمین کی مقامی لوگوں پر سختیوں کو بیان کرنے کے بعد اپنی بحث کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ہم نے یہاں ہندوستان میں برطانیہ کی سچی تاریخ سے ایک معتدل سا حصہ پیش کیا ہے ان واقعات کے پیش نظر غیر جانبدارانہ اور صاحب فکر لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا کسی قوم کی یہ کوشش بجا نہیں ہے کہ وہ ان غیر ملکی فاتحوں کو نکال باہر کرے جو اپنی رعایا کے ساتھ ایسا برا سلوک کرتے ہیں اور اگر انگریز لوگ ایسی باتیں سنگدلی کے ساتھ کر سکے تو کیا اس پر حیرت ہوگی کہ باغی ہندوستان اپنی بغاوت اور تصادم کے طوفان میں انہیں جرائم اور مظالم کے مرتکب ہوں جو ان پر کیے جاتے ہیں۔[8]

مارکس اور اینگلز ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ، اس کے استعماری ہتھکنڈوں اور استحصالی پہلوؤں کو سامنے لائے۔ کاشتکاروں کے مسائل سامنے لائے اور طبقاتی رویوں اور پیداواری قوتوں کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کیا۔ مارکسٹ نقطہ نظر اور ان کا مخصوص تجزیاتی طریقہ کار ایک دبستان فکر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس رجحان اور طریقہ کار کے تحت ۱۸۵۷ء کی

بغاوت اور اس کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کیا گیا جس کی نمایاں مثال پی سی جوشی اور تلمیذ خلدون کے مضامین ہیں جو کہ پی سی جوشی کی مرتبہ 'انقلاب ۱۸۵۷' میں شامل ہیں۔

ابتدائی ادوار میں لکھے جانے والے تاریخی ادب میں انگریز مورخین کا ایک تجزیاتی رجحان بغاوت کو مسلمانوں کی سازش کے تناظر میں دیکھنا ہے۔ چونکہ انگریزوں کو سیاسی اقتدار و قوت مغلیہ سلطنت کی قوت کو ختم کر کے حاصل ہوا تھا اور پھر یہ کہ باغیوں میں جہادیوں کی صورت میں اضافہ ہوتا رہا جسے آگے چل کر وہابیوں کی بغاوت میں شمولیت کا نام بھی دیا گیا۔ غالباً اس لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ذمہ داری مسلمانوں کے کندھے پر ڈالی گئی اور اسے محمڈن سازش (Mohammadan Conspiracy) کہا گیا۔ ان منتظمین میں جنہوں نے اس نقطہ نظر کو بڑھایا ولیم میور (William Muir)، الفریڈ لائل (Alfred Lyall) اور رابرٹس (Roberts) کے نام نمایاں ہیں[۱۰] غلام رسول مہر نے اس ضمن میں ہنری میڈ (Henry Mead) کی کتاب 'سپاہیوں کی بغاوت اور اس کے اسباب' کا ذکر کیا ہے۔ اور لاہور کرانیکل سے اس کتاب کے بارے میں الفاظ درج کرتے ہیں کہ:

> اس سرکشی کو موجودہ مرحلے میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا۔ لیکن بہت جلد اس کی حقیقی حیثیت آشکارا ہو گئی یعنی یہ اسلامی بغاوت تھی۔[۱۱]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک متنازعہ پہلو اسے غدر اور سرکشی یا جنگ آزادی قرار دینے کے حوالے سے ہے۔ بغاوت کی ابتدائی دھائیوں میں لکھے جانے والے تاریخی ادب میں خصوصاً اور بعد میں بھی اس کے لیئے سپاہیوں کی لڑائی (Sepoy War)، غدر (Mutiny) اور سرکشی وغیرہ کے نام استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بغاوت جس کا آغاز بنگال ریجمنٹ میں سپاہیوں کی بے چینی سے ہوا اور ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے فوجی کیمپ میں اس نے باقاعدہ بغاوت اور شورش کی شکل اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے مختلف علاقوں کے مقامی سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے اور انگریز سپاہی، افسران اور تمام برطانوی شہری بلا امتیاز ان کا نشانہ بنے۔ اس بغاوت میں سپاہیوں کے نمایاں کردار کی وجہ سے اسے سپاہیوں کی بغاوت یا غدر قرار دیا۔ تاہم ابتداء میں سپاہیوں کی نظر آنے والی بغاوت میں جلد ہی معاشرے کے دیگر طبقے اور حلقے شامل ہوتے گئے اور اس بغاوت

نے عام شورش کی شکل اختیار کر لی جس کی وجہ سے اسے عوامی یا قومی بغاوت بھی کہا گیا اس نسبت سے یہ برصغیر کے لوگوں کی انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد قرار پائی یہی وجہ ہے کہ بار بار یہ سوال اٹھتا رہا ہے کہ آیا یہ غدر ہے، بغاوت یا قومی آزادی کی جدوجہد۔ اولین طور پر اس کا جواب برطانوی منتظمین کی جانب سے آیا جب ڈزرائیلی (Disraeli) نے ۲۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ہاؤس آف کامنز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحریک فوجی غدر کے بجائے ایک قومی بغاوت ہے۔[۱۲] جبکہ ہندوستان کا گورنر جنرل لارڈ کیننگ (Lord Canning) اعتراف کرتا ہے کہ بغاوت مختلف مراحل سے گزری اور مذہبی تحفظ کی کوشش سے ہوتی ہوئی سیاسی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی[۱۳] جسٹس میکارتھی (Mac Carthy) نے لکھا کہ:

> اس کو کسی طرح بھی محض فوجی غدر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف یہ فوجی شکایتوں، قومی نفرت اور مذہبی تعصب کا ایک مشترکہ محاذ تھا۔ اس میں دیسی حکمراں بھی شامل تھے اور دیسی سپاہی بھی۔ عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے قدیم مذہبی اختلافات کو بھلا دیا تھا۔[۱۴]

اگرچہ کہ کچھ سطحوں پر برطانوی منتظمین نے بغاوت کی نوعیت کو قومی، سیاسی بغاوت اور مقامی لوگوں کا انگریزوں کے خلاف مشترکہ محاذ قرار دیا لیکن عام طور سے بغاوت پر لکھے جانے والے ابتدائی تاریخی ادب میں سپاہیوں کی بغاوت اور غدر کے عنوان کو ہی اہمیت حاصل رہی۔

برصغیر کے لوگوں کی جانب سے اسے جنگ آزادی قرار دینے والوں میں اولین نام وی ڈی ساورکار (V.D. Savarkar) کا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں اس نے ہندوستانی قومی پرست کے فرضی نام سے لندن سے ایک کتاب چھپوائی جس کا عنوان تھا The Indian War of Independance یعنی اس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو انگریزوں کے خلاف برصغیر کے لوگوں کی بغاوت قرار دیا جو کہ برطانوی استعماریت کا جوا اتار پھینکنے کی کوشش تھی۔ ساورکار کا مقصد بغاوت میں شریک لوگوں کی بہادری کے قصہ بیان کر کے ہندوستان کے نوجوانوں میں وطن پرستی کے جذبات بیدار کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کا عنوان اور مواد کسی طور بھی برطانوی استعماریت کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی جو کہ ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت کے

خاتمہ تک قائم رہی۔ تاہم ہندوستان اور پاکستان میں برطانوی استعماریت کے تسلط سے آزادی کی جدوجہد شعوری طور سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے جڑ گئی اور اکثر قومی جدوجہد آزادی کے سلسلے کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے جوڑا جاتا ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھتا رہا کہ آیا اسے ایک قومی جدوجہد کہا جائے یا غیر ملکی تسلط سے نجات کی مختلف گروہی سطح پر کوششیں۔ جیسا کہ تاراچند سمجھتے ہیں کہ:

> یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا محرک کوئی قومیت کا جذبہ نہیں تھا اس لیے کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے ایک قوم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا لیکن دونوں فرقوں کے قائدوں اور ان کے ساتھیوں نے ایک مشترک مادر وطن کی وفاداری کے بجائے ذاتی وفاداریوں سے تحریک پائی۔ اس کے باوجود ۱۸۵۷ء کی شورش ہندوستان کو بدیسیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جنگ تھی۔ [۱۵]

پاکستانی مورخین میں سید معین الحق بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح یہ انقلابی تحریک ترتیب دی گئی اور آگے بڑھی اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ لوگوں کو برطانوی استعماریت کے پنجے سے آزاد کرانے کی ایک کوشش تھی۔ [۱۶] اور شواہد اس کے عکاس ہیں کہ وہ ایک قومی انقلاب تھا۔ [۱۷]

تاہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مراکز، واقعات کی نوعیت، سماجی طبقات، سیاسی اور گروہی مفادات وغیرہ اتنے ہمہ جہت ہیں کہ انہیں صرف سپاہیوں کی بغاوت، غدر یا جنگ آزادی کے دائرہ میں محدود نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی صرف ان حوالوں سے تاریخ کا تجزیہ اس وقت کے صحیح حالات واسباب کا ادراک وشعور دے سکتا ہے جیسا کہ سی اے بیلے (C.A. Bayly) نے کہا کہ اس کے لئے کوئی ایک عنوان نہیں بنایا جاسکتا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کوئی ایک تحریک نہیں تھی۔ اسے کاشتکاروں کی بغاوت کہا جائے یا قومی آزادی اس کے کئی پہلو تھے اور اس کے خدوخال ضلع تا ضلع اور گاؤں تا گاؤں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ [۱۸]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ہمہ جہت نوعیت کو سمجھنے کی یہی کوشش ہے جو اس کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے تاریخی ادب میں نظر آتی ہے اور مورخین دلائل ونتائج اخذ کرنے کے حوالے سے علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نئے ماخذ کی دریافت اور نئے تجزیاتی رجحانات کی روشنی میں

ایسے گوشوں سے نقاب اٹھا رہے ہیں کہ جنہیں ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا تھا یہ چیز نمایاں طور پر ۱۹۵۷ء میں بغاوت کے سو سال پورے ہونے والے سیمینارز، سمپوزیم اور شائع ہونے والی کتابوں میں نظر آتی ہے۔ تاہم جنگ آزادی کا حوالا ہندوستانی اور پاکستانی مورخین کے یہاں بہر حال اہمیت کا حامل ہے۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے سو سال پورے ہونے پر ۱۹۵۷ء میں کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں اور سیمینارز اور سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ یہاں ہم ان میں سے چند کا ذکر کریں گے جو کہ نمائندہ نقطہ نظر کی عکاس ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انڈین گورنمنٹ کی طرف سے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے سالانہ اجلاس میں ایس این سین کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر تحقیق کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سین کی کتاب ۱۹۵۷ء میں Eighteen Fifty Seven کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس نے بغاوت کو آزادی کی جدوجہد کے تناظر میں تو دیکھا لیکن اسے ایک قومی جدوجہد تسلیم نہیں کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جو جنگ مذہب کے لیے شروع ہوئی وہ جنگ آزادی کی صورت میں ختم ہوئی۔ تاہم قومیت کا نظریہ اس بغاوت پر نہیں لگایا جا سکتا۔ تصور قومیت اس وقت ابتدائی مراحل میں تھا اور قوم سے وفاداری علاقائی معنوں میں تھی اسٹوک کے مطابق سین کا لہجہ مدبرانہ اور معتدل ہے اور ان کی توجیہات بہت کم برطانوی مورخ جون کے کی رائے سے مختلف ہے۔[19] ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے اہم رہنما جواہر لال نہرو بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو ایک مقبول تحریک تو سمجھتے ہیں لیکن قومی تحریک نہیں اور جو انکے خیال میں فیوڈل سرداروں کی سرکردگی میں اٹھنے والی ایک فیوڈل طبقہ کی بغاوت تھی کیرسٹوفر ہیبرٹ (Christopher Hibbert) اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ:

> گاندھی کے ماننے والے جنہوں نے تشدد کو مسترد کر دیا تھا ان کی رائے برہمن، راجہ رام موہن رائے جیسے بیش بین دانشوروں سے زیادہ ہم آہنگ تھی یہ نسبت ۱۸۵۷ء کے رجعت پسند باغیوں سے کہ جن کے طریقہ کار کو انہوں نے مسترد کر دیا۔[20]

S. B. Chaudhuri نے Civil Rebellion in the Indian Mutinies (۱۹۵۷ء) میں مختلف شواہد کی مدد سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو شہری بغاوت قرار دیا اور

واضح کیا کہ کسی طرح ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی یہ بغاوت عوامی بغاوت میں بدل گئی۔ البتہ R.C. Majumdar کی The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857 (۱۹۵۷ء) میں ایک متضاد رجحان نظر آتا ہے وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو نہ ہی جنگ آزادی مانتے ہیں اور نہ ہی قومی جنگ ان کے نزدیک اس کا دائرہ یوپی اور اس کے آس پاس کے علاقوں تک محدود تھا اور جنگ کے رہنماؤں کے سامنے قومی یا عوامی مفاد کے مقابلہ میں ذاتی مفادات زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

۱۹۵۷ء میں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے سو سال ہونے پر ایک سمپوزیم میں پڑھے گئے مقالات کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مقالات 'انقلاب ۱۸۵۷' کے عنوان سے پی سی جوشی نے کتابی صورت میں مرتب کیے۔ پی سی جوشی ایک جانے مانے مارکسٹ ہیں اور مقالات لکھنے والوں کی اکثریت بھی اس نکتہ نظر کی حامل ہے۔ کتاب میں مارکسٹ تجزیہ تاریخ نمایاں ہے اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو سمجھنے کے نئے پہلو اجاگر کرتا ہے۔ ساتھ ہی مقالات کے موضوعات کی متنوع نوعیت بغاوت کے معاشرہ پر دوررس اثرات، ادب اور لوک گیتوں میں اس کا بیان اور دوسرے ممالک (برطانیہ، فرانس، اٹلی اور چین) میں بغاوت پر آراء کا تجزیہ فراہم کرتی ہے۔ تلمیذ خلدون ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو بغاوت عظیم کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ اسے مقبول عام بغاوت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن قومی آزادی کی جنگ نہیں ان کے مطابق اس وقت ہندوستانیوں میں قومیت کا کوئی ایسا جذبہ نہیں پایا جاتا تھا جیسا کہ مفہوم آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے۔[۲۱] خلدون نے بغاوت کا بنیادی سبب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں مقامی لوگوں کی اقتصادی استحصال کو قرار دیا ہے۔ اور اس کی ناکامی میں طبقاتی کردار کی وضاحت کی ہے۔ پی سی جوشی کا البتہ یہ ماننا ہے کہ وہ ایک قومی انقلاب اور عوامی بغاوت تھی۔ بقول ان کے:

> ۵۸-۱۸۵۷ء کی بغاوت کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تباہی اور اس کی جگہ ہندوستانی حکومت کا قیام تھا پہلا ایک تخریبی قدم تھا اور دوسرا جدوجہد کا تعمیری جز تھا۔ اگر اس سے یہ شورش قومی بغاوت کا رنگ اختیار نہیں کرتی تو اور کس چیز سے کرے گی۔[۲۲]

مارکسٹ نقطہ نظر کے حامل جوش ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصالی ہتھکنڈوں، جاگیرداری نظام کی توڑ پھوڑ اور نئی ابھرنے والی قوتوں کا ذکر کرتے ہیں ان کا تجزیہ ہے کہ جاگیرداری نظام اگرچہ بکھر رہا تھا اور جمہوری خیال کی حامل نئی قوتیں ابھر رہی تھیں تاہم ابھی وہ اتنی قوت نہیں رکھتی تھیں کہ قدیم جاگیرداری نظام اور برطانوی حکام پر حاوی ہوسکیں۔[۲۳] جوشی نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کسانوں کے کردار کو نمایاں اہمیت دی ہے اور سمجھتے ہیں کہ تمام طبقوں سے زیادہ کسانوں نے اس بغاوت میں قربانیاں دیں۔[۲۴]

یہ نقطہ نظر زیادہ نمایاں طور پر ایرک اسٹوکس کے یہاں نظر آتا ہے جس کی کتابیں The Peasant and the Raj : Studies in Agrarian Society and Peasent Peasant Armed, The اور (۱۹۷۸ء) Rebllion in Colonial India (۱۹۸۶ء) Indian Revolt of 1857 ہیں۔ کنور محمد اشرف نے اپنے مقالہ میں اسلام پسند حلقوں کے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کردار کے حوالے سے بات کی ہے اور اس ضمن میں وہابی تحریک کے کردار کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ آج کل بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات کے حوالے سے یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ اس میں مذہب یا جہادی عناصر کا کردار کس حد تک تھا اور آیا کیا اس کی گہری جڑیں مذہب میں پیوست تھیں۔[۲۵] سیموزیم کے دیگر مقالات میں ہندی، اردو، بنگالی ادب اور لوک گیتوں میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی نسبت سے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے سماجی و معاشرتی سطح پر بغاوت کے اسباب واثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں پاکستان میں ۱۸۵۷ء کے سو سال ہونے پر اگرچہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا کانفرنسیں ہوئیں، یادگاری ٹکٹ کا اجراء ہوا اور کراچی سے ایک وفد مغلوں سے عقیدت کے اظہار میں بہادر شاہ ظفر کی قبر پر پھول چڑھانے رنگون گیا لیکن جہاں تک ۱۸۵۷ء کے واقعات پر تحقیقی کام کی اشاعت کا تعلق ہے اس ضمن میں زیادہ کام نظر نہیں آتا۔ اخبارات ورسائل میں لیل ونہار، انقلاب، امروز اور جنگ کی خصوصی اشاعتیں ہوئیں۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے غلام رسول مہر کی دو کتابیں شائع ہوئیں ایک '۱۸۵۷ء پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی' اور دوسری 'اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد' غلام رسول مہر غدر کو جنگ آزادی تسلیم کرتے ہیں۔[۲۶] ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ وہ ایک فرقہ وارانہ تحریک نہیں تھی اور نہ اسلامی

بغاوت بلکہ اس کے مقاصد سیاسی تھے اور ہندو اور مسلمان دونوں اس میں شریک تھے۔[۲۷] تاہم شہر دہلی کے حوالے سے ایک جگہ انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ابتداء میں ہندو مسلم اختلافات بالکل نہیں تھے لیکن بعد میں شک وشبہات پیدا ہونے لگے اور پھر جب بخت خان نے جہاد کے فتویٰ کا نعرہ بلند کیا تو اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں زیادہ سختی آ گئی۔[۲۸] اس بات کا زیادہ واضح اعادہ ان کی موخر الذکر کتاب کے مقدمہ میں نظر آتا ہے جہاں ان کے مطابق اس جہاد میں سب سے بڑھ کر حد درجہ ممتاز حصہ مسلمانوں نے لیا۔[۲۹] انہوں نے نمایاں طور پر جن ۲۳ مجاہدین کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف پانچ ہندو ہیں۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر کسی پاکستانی پروفیشنل مورخ کی کتاب سید معین الحق کی The Great Revolution of 1857(۱۹۶۸ء) ہے۔ اس میں پاکستان میں پائے جانے والے دو قومی نظریہ کی واضح عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ تقسیم سے قبل کے ہندوستان کے لیے ہندوستان، انڈیا یا برصغیر پاک و ہند کے بجائے ہند پاکستان کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ اصطلاح ہے جو کہ پاکستان کے قیام کے ابتدائی سالوں میں اختیار کی گئی لیکن مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور برصغیر پاک و ہند کی اصطلاح ہی زیادہ مروج رہی۔ معین الحق کا بنیادی نقطہ نظر یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پیچھے مسلمان تھے تاہم کچھ ہندو لیڈر اور بڑی تعداد میں ہندو سپاہی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے لیکن جب تحریک کمزور پڑنا شروع ہوئی تو چند استثناء کے علاوہ سب ساتھ چھوڑ گئے اور انگریزوں نے اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھا اور اس کے نتائج بھی مسلمانوں کو سہنا پڑے۔[۳۰] معین الحق ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو قومی آزادی کی تحریک مانتے ہیں اور اس نقطہ نظر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بغاوت کی تیاریاں پہلے سے منظم طریقے سے جاری تھیں یہاں تک کہ انقلابیوں کی طرف سے ۳۱ مئی کی تاریخ عام بغاوت کے لیے مقرر کر دی گئی تھی۔[۳۱] جبکہ ۱۰ مئی کو سپاہیوں کی بغاوت کے نتیجے میں اس پلان کو دھچکا پہنچا جو کہ بغاوت کی ناکامی کا ایک سبب بھی رہا۔[۳۲]

۱۹۶۰ء کے عشرہ کے بعد بھی اگرچہ بغاوت کے تجزیہ میں غدر یا جنگ آزادی کے حوالے کو اہمیت حاصل رہی لیکن ساتھ ہی اس کے سیاسی، مذہبی، معاشی، سماجی، طبقاتی، علاقائی اور ادبی پہلوؤں کو بھی اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ یہ حوالے اگرچہ پچھلی کتابوں میں بھی موجود تھے لیکن

سرسری طور سے جیسا کہ جون ولیم کے کے یہاں بغاوت میں کسانوں کے کردار کا ذکر جو زیادہ واضح صورت میں مارکسٹ نقطہ نظر کی حامل تحریروں میں اور ایرک اسٹوکس کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی سامنے آیا کہ بغاوت ان روایت پسند حلقوں کی جانب سے ہوئی جن کے مفادات کو برطانوی پالیسیوں کے نتیجے میں زد پہنچی۔

۶۰ کے عشرہ میں سب سے نمایاں کتاب تھامس میٹکالف (Thomas Metcalf) کی *The Aftermath of Revolt: India 1857-1870* (۱۹۶۴ء) ہے۔ یہ دراصل غدر اور اس کے بعد کے اثرات کے تجزیہ پر مشتمل ہے جس میں سماجی اصلاح، تعلیم، معاشی پالیسی، ریاستوں کے ساتھ تعلقات اور حکومتی ڈھانچہ میں تبدیلی اور اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ میٹکالف کے تجزیہ کے مطابق ۱۸۵۷ء کی بغاوت سپاہیوں کی بغاوت سے بڑھ کر تھی اور ہندوستان کے لوگوں کی اس طرف متوجہ ہونے اور حصہ لینے کی کئی وجوہات تھیں۔ بغاوت میں حصہ لینے والوں میں سب سے نمایاں وہ قدامت پسند عناصر تھے جو برطانوی نظام کے ہاتھوں سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ ان میں برہمی پنڈت، مسلمان مولوی، زمیندار، تعلقہ دار وغیرہ شامل تھے۔ دوسری جانب کسان تھے جسے برطانوی نظام سے خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچا۔[۳۳] اس دھائی میں بغاوت کے عمومی جائزہ کے علاوہ علاقائی حوالوں سے بھی بغاوت کے مراکز اور سرگرمیوں کو بھی موضوع بنایا گیا۔ اطہر عباس رضوی اور ایم آئی بھرگاوا (M.I. Bhargava) نے حکومتی سرپرستی میں تاریخی دستاویزات کی روشنی میں پانچ جلدوں میں *Freedom Struggle in Uttar Pardesh* (۱۹۵۷ء۔۱۹۶۰ء) مرتب کی۔ اس کے علاوہ یہ رجحان بھی رہا کہ بغاوت میں شریک نمایاں شخصیات اور لیڈروں کو ہیروز کے طور پر متعارف کرایا جائے۔ دھرم پال (Dharam Paul) کی *Tatya Tope: The Hero of India's Frist War of Independence* اور پریتو چندر گپتا کی *Nana Sahib and the Rising at Cawnpore* (۱۹۶۳ء) ہیں۔

۷۰ کے عشرہ میں مائیکل ایڈورڈز (Michael Edwards) کی *Red Year: The Indian Rebellican of 1857* (۱۹۷۵ء) اور کرسٹوفر ہیبرٹ (Christopher Hibbert) کی *The Great Mutiny of India 1857*

(۱۹۷۸ء) ہیں۔ان میں ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ موخرالذکر کتاب کے مصنف کے مطابق اس نے ایک ہی جلد میں ان تمام واقعات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو جون کے اور میلسن کی ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر چھ جلدوں میں ہیں۔[۳۴]

۸۰ کے عشرہ میں ایرک اسٹوکس (Eric Stokes) کی کتاب *Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857* (۱۹۸۶ء) میں کسانوں کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بغاوت میں کسانوں کے نمایاں کردار کا ذکر کارل مارکس اور اینگلز کی تحریروں اور بعد کے مارکسٹ مورخین کے یہاں نظر آتا ہے تاہم اسٹوکس نے زیادہ تفصیل سے کسانوں کی مسلح بغاوت کے اسباب و عوامل کو بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق کسی بھی واقع میں فوجی بغاوت اور دیہی شورش کے درمیان کسان بنیادی رابطہ تھے۔ حقیقتاً بغاوت کسانوں کی فوج کی بغاوت تھی جس نے اپنے غیر ملکی آقاؤں سے رابطہ توڑ لیا تھا۔[۳۵] سبالٹرن نقطہ نظر کہ جس میں محکوم یا نچلے طبقہ کے حوالے سے تاریخ کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اسے ہندوستان کی جدید تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں کے جائزہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم اس حوالے سے تھوڑا بہت کام ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر بھی کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں رانا جیت گوہا جو کہ اس دبستان کی فکری بنیاد رکھنے والوں میں سے ہیں، ان کا ایک کام *Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India* (۱۹۸۳ء) ہے۔ اس میں ۱۷۸۳ء تا ۱۹۰۰ تک کسانوں کی بے چینی کا جائزہ لیا گیا ہے اور یوں ۱۸۵۷ء کے حوالے سے بھی نقطہ نظر سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے اس نقطہ نظر کو چیلنج کیا ہے کہ کسان ایسے بے قوت ایجنٹ تھے جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے برطانوی استعماریت اور مقامی زمینداروں کے استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ گوہا کا کہنا ہے کہ کسان پوری آگاہی رکھتے تھے اور ان میں سیاسی تبدیلی پر اثر انداز ہونے کا جذبہ بھی تھا۔ سبالٹرن دبستان کے عکاس گوتم بھدرا (Gautam Bhadra) کے سبالٹرن اسٹڈیز کے تحت شائع ہونے والے مضمون 'Four Rebels of 1857' (۱۹۸۵ء) اور رودرنگھشو مکھرجی (Rudrengshu Mukherjee) کی *Avadh in Revolt 1857-58: A Study of Popular Resistance* (۱۹۸۴ء) ہیں۔

۹۰ کے عشرہ میں اس فکری رجحان کی نمائندہ کتاب ٹپتی رائے (Tapti Roy) کی

The Politics of a Popular Uprising: Bundelkhand in 1857 (۱۹۹۴ء) ہے۔ سلیم الدین قریشی نے *Cry for Freedom Proclamations of Muslim Revolutionaries of 1857* (۱۹۹۷ء)۔ اس میں باغی رہنماؤں کی جانب سے جاری کیے گئے پندرہ کے قریب فرمان جمع کیے گئے ہیں جنہیں برطانوی منتظمین نے انگریزی میں ترجمہ کر کے سرکاری دستاویزات میں محفوظ رکھا تھا۔ مرتب کے مطابق تمام فرمانوں میں جو موضوع نمایاں ہے وہ برطانوی دورِ اقتدار میں مقامی لوگوں کا استحصال اور ناانصافی کا احساس اور انگریزوں کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنا کر آزادی کی خواہش کی تکمیل۔ ۳۶

۲۰۰۰ء کی دھائی میں پی ایس مکھریا (P.S. Mukharya) کی *The Revolt of 1857: Saugar and Nerbudda Territories* (۲۰۰۷) ہے جس میں مخصوص علاقے میں بغاوت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ امریش مسرا کی *War of Civilizations: India AD1857* میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے نتیجہ میں کہیں بڑی تعداد میں مقامی لوگوں کا قتلِ عام کیا گیا اور ایک لاکھ کے بجائے دس سال کے عرصہ میں دس ملین لوگ قتل ہوئے۔ اس کے اس دعویٰ اور اس میں پیش کیے گئے دلائل کا مورخین کی جانب سے ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ گوتم چکرورتی نے انگریزی ادب کا تجزیہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اثرات کے حوالے سے اپنی کتاب *The Indian Mutiny and the British Imagination* (۲۰۰۵ء) میں لیا ہے۔

متذکرہ حوالوں کے علاوہ ہندوستان میں خصوصیت سے نئے حوالوں سے بھی کام سامنے آ رہا ہے جیسے دلت اور عورتوں کا جنگ آزادی میں کردار وغیرہ۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک ۱۸۵۷ء کی بغاوت، غدر یا جنگ آزادی پر اس عنوان کے تحت بہت کتابیں لکھی گئی ہیں اور اگر اس میں ان کتابوں کو بھی شامل کر لیا جائے جس میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک ذیلی لیکن اہم عنوان کی حیثیت رکھتی ہے تو یہ ادب کئی گنا پھیل جائے گا۔ جو کتابیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی زیر عنوان ہی لکھی گئی ہیں ان کے اس سرسری مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اسے غدر یا سپاہیوں کی بغاوت اور جنگ آزادی کے دو متضاد ذہنی، فکری رویہ اور تناظر میں تقسیم کیا گیا لیکن ابتداء ہی سے اس کے اسباب و عوامل اور تجزیہ میں تنوع نظر آتا ہے۔ ابتدائی برطانوی تاریخ نگار جن میں

منتظمین، فوجی وغیرہ بھی شامل تھے، اگر نسلی برتری کا پہلو نمایاں ہے تو کہیں کہیں واقعات کو حقائق کے تناظر میں سمجھنے یا بیان کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس طرح ہندوستان کے مورخین میں جہاں ایک مضبوط حلقے نے اسے جنگ آزادی کی جدوجہد کی روشنی میں دیکھا وہیں کچھ حلقوں نے دیگر حوالوں سے بھی بحث کی اور یہی چیز ماضی یا تاریخ کو جاننے کا عمل ہے۔ جوں جوں ماضی کو جاننے، سیاست و معاشرت کو سمجھنے کے لیے دبستان قائم ہوتے گئے ۱۸۵۷ء کے مطالعہ پر بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ کسی بھی واقعہ کے ہونے کے عوامل اور نتائج واثرات کی ہمہ گیریت کو جب تسلیم کرلیا گیا تو اس کا صرف سیاسی پہلو ہی نہیں رہا بلکہ علاقائی، معاشی، معاشرتی، شخصی، مذہبی، ادبی، طبقاتی سبھی کچھ آ گیا۔ یہی سب پہلو ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر لکھے گئے تاریخی ادب میں بھی نظر آ رہے ہیں۔

حوالہ جات

1) S.N. Sen, 'Writings on the Mutiny', in *Historians of India Pakistan and Ceylon,* C.H. Philips (ed.) (London: Oxford University Press, 1961), p.373.

2) Eric Stokes, *The Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857*, C.A. Bayly (ed.) (Oxford: Clarendan Press, 1986), p.4.

3) John Kaye, *The History of Indian Mutiny*, G.B. Malleson (ed.) (Lahore: Sheikh Mubarak Ali, 1976), p.XIV.

۴) ایڈورڈ تھامسن (Edward Thompson)، 'انقلاب ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ'، شیخ حسام الدین (مترجم) (لاہور: گوتم پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۳۶۔

۵) معین الدین احسن خان اور منشی جیون لال کے روزنامچوں یا یادداشتوں کا انگریزی میں ترجمہ کرکے چارلس میٹکالف (Charles Metcalfe) نے *Two Narratives of the Mutiny in Delhi* کے عنوان سے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا۔

۶) ضیاء الدین لاہوری (مرتبہ) 'خودنوشت حیات سرسید' (کراچی: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۱۲۷ تا ۱۲۸، ۱۳۱۔

۷) کارل مارکس، 'ہندوستان کا تاریخی خاکہ'، احمد سلیم (مرتبہ) (لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۲ء) صفحہ ۲۴۶۔

۸) ایضاً، صفحہ ۲۹۱۔

۹) پی سی جوشی، ''ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء''، 'انقلاب ۱۸۵۷ء'، پی سی جوشی (مرتبہ) (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)

۱۰) وضاحت کے لیے دیکھیے ایرک اسٹوکس، محولہ بالا، صفحات ۷۔۹۔

۱۱) غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء: پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء)، صفحہ ۴۵۶۔

۱۲) تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند، غلام ربانی تاباں (مترجم) (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، جلد دوم، صفحہ ۴۲۔

13) Salim al Din Qureshi (comp), *Cry for Freedom: Proclamations of Muslim Revolutionaries of 1857* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1997), pp.v-vi.

۱۴) تاراچند، محولہ بالا، صفحہ ۴۳۔

۱۵) ایضاً، صفحہ ۴۴

16. Syed Moin ul Haq, The Great revolution of 1857 (Karachi: Pakistan Historical Society, 1968), p.75

17. Ibid, p.81

18. C.A Bayly, 'Editor's concluding note', in *The Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857*, op.cit, p.226

19. Eric Stokes, *The Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857*, Ibid, p.6

20. Christopher Hibbert, *The Great Mutiny: India 1857* (England: Penguin Books, 1983), p.391

۲۱) تلمیذ خلدون۔ "جنگِ عظیم"، "انقلاب ۱۸۵۷ء"، پی سی جوشی (مرتبہ)، محولہ بالا، صفحہ ۱۵

۲۲) پی سی جوشی، "ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء"، "انقلاب ۱۸۵۷ء"، ایضاً، صفحہ ۱۵۰۔

۲۳) ایضاً، صفحہ ۱۹۸۔

۲۴) ایضاً، صفحہ ۱۹۹۔

25. See William Dalrymple's *The Last Mughal*, London: Bloomsbury, 2006

۲۶) غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی، محولہ بالا، صفحات ۱۱، ۶۴، ۳۴۔۳۵، ۷۰

۲۷) ایضاً صفحات ۳۴، ۴۵۵۔

۲۸) ایضاً، صفحات ۱۵۶۔۱۵۷۔

۲۹) غلام رسول مہر، اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء)، صفحات ۱۰۔۱۱۔

30) Syed Moin ul Haq, *op.cit.*, p.555.

31) *Ibid.*, p.73.

32) *Ibid.*, p.75.

33) Thomas R. Metcalfe, *The Aftermath of Revolt: India 1857-1870* (New Delhi: Manohar Publications, 1990), pp.61-65.

34) Christopher Hibbert, *op.cit.*, p.11.

35) Eric Stokes, *op.cit.*, p.14.

36) Salim al Din Qureshi, *op.cit.*, p.xiii.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ۔ چند نظری پہلو

ڈاکٹر سید جعفر احمد

اب سے ڈیڑھ سو سال قبل ۱۸۵۷ء میں ہندوستان ایک ہمہ گیر مگر ناکام بغاوت کے بعد سلطنتِ برطانیہ کی مقبوصات میں شامل ہوا اور پھر نوّے (۹۰) سال کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد ہی غلامی کا یہ طوق اس کی گردن سے اُتر سکا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس کو جنگِ آزادی بھی قرار دیا جاتا ہے، غیر معمولی اہمیت کا حامل تاریخی واقعہ تھی۔ اس واقعے کے حقیقی پس منظر، اس کے سماجی اور سیاسی عوامل اور اسباب اور اس کے دوررس مضمرات کے بارے میں مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے اور اب بھی جبکہ اس واقعے کو ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، تاریخ کے طالب علموں کی اس میں دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے۔

اس واقعے کے بارے میں جہاں تصنیف و تالیف کے کام میں قابل ذکر پھیلاؤ آیا ہے وہیں اس کی نسبت نت نئے مباحث اور سوالات بھی اٹھتے رہے ہیں۔ مثلاً مؤرخین ایک زمانے سے یہ بحث کرتے آئے ہیں کہ کیا ۱۸۵۷ء کی بغاوت، جنگ آزادی کے زمرے میں آتی ہے یا انگریز کا اس کو 'غدر' قرار دینا ٹھیک تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی ایک عرصہ زیر بحث رہی کہ اس بغاوت کی وسعت کیا تھی؟ کیا یہ ایک ملک گیر بغاوت تھی یا محض چند علاقوں سے اٹھنے والی شورش کو اہلِ شوق نے جنگ آزادی کا نام دے دیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کو مذہبی رنگ میں دیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ چنانچہ فرقہ پرست مؤرخین نے اس جنگ کو تمام و کامل اپنے اپنے مذہب کے ماننے والوں کے جذبۂ آزادی کا مظہر قرار دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ انتہا پسند ہندو مؤرخین نے

اپنی تحریروں میں اس جنگ کا ایک ایسا نقشہ کھینچا جس میں مسلمانوں کے کردار کو گھٹا کر بیان کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ ادھر مسلمان مؤرخین میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی جنہوں نے اس جنگ میں ہندوؤں، سکھوں اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے کردار سے یا تو صرفِ نظر کیا یا اس کا ذکر محض سرسری طور پر کر کے آگے بڑھ جانے کا رویہ اختیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں نہ صرف باغیوں میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے[1] بلکہ انگریزوں کا ساتھ دینے والے غدّارانِ وطن میں بھی دونوں مذاہب کے ماننے والے پیش پیش تھے۔[2]

تقسیمِ ہند سے قبل ہندوستان میں متحدہ قومیت کے تصور کے زیرِ اثر جو تاریخ نویسی ہوئی اور جس کا تسلسل تقسیم کے بعد بھی وہاں جاری رہا اس کا بنیادی داعیہ کیونکہ ہندو مسلم اتحاد اور ہم آہنگی کے تصورات ہی تھے لہٰذا ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کی شرکت اس داعیے کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ چنانچہ وہاں بحیثیت مجموعی ۱۸۵۷ء کے بارے میں اہلِ قلم کا رویہ تاریخی حقائق سے قریب رہا۔ البتہ انتہا پسند حلقے خاص طور سے ہندو بنیاد پرستی کی علمبردار راشٹریہ سیوک سنگھ اور اس کی جدید سیاسی تشکیل یعنی بی۔ جے۔ پی کے زیرِ اثر تاریخ کو 'ہندوانے' کا عمل شروع ہوا تو ۱۸۵۷ء کی تعبیر بھی اسی نہج پر کی جانے لگی کہ جیسے یہ ہندوؤں کا انگریزی استعمار کے خلاف احتجاج تھا جس میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ طرزِ فکر صرف ایک حد تک ہی آگے جا سکا اور ہندوستان کے سیکولر حلقوں نے فوراً ہی اس رجحان کا علمی سطح پر مقابلہ کرتے ہوئے تاریخ کو مسخ ہونے سے بچا لیا اور جن نصابی کتابوں کو بی۔ جے۔ پی کے دورِ حکومت میں تبدیل کر دیا گیا تھا ان کو از سرِ نو درست کر دیا گیا۔

پاکستان میں صورتِ حال بالکل مختلف رہی۔ پاکستان کا مطالبہ کیونکہ دو قومی نظریے کے تصور کے ساتھ اُٹھا تھا لہٰذا قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے سرکاری اور روایتی تاریخ نویسوں نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان کی ساری پچھلی تاریخ کو دو جدا قومیتی وحدتوں کے حوالے سے تقسیم کر کے پیش کریں حالانکہ تاریخ کی یہ تعبیر خود دو قومی نظریے کے استناد کے لیے ضروری نہیں تھی۔ دو قومی نظریہ ایک سیاسی تصور تھا جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان کی مسلم سیاسی اشرافیہ اور متوسط طبقے کے معاشرتی اور سیاسی مفادات کی تکمیل کا ذریعہ بن

سکتا تھا۔ اسی نظریے کو بنیاد بنا کر مذکورہ حلقوں نے پہلے متحدہ ہندوستان کے دائرے میں اپنے حقوق اور مفادات کے حصول کی کوشش کی اور بعدازاں یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی اساس بنا۔ لیکن جیسا کہ بالعموم قومیتی سیاست میں ہوتا ہے کہ حال کے سیاسی موقف کو ماضی سے تقویت پہنچائی جاتی ہے، چنانچہ ہمارے یہاں بھی تاریخ نویسوں نے دوقومی نظریے کو ماضی کی ہزار سالہ تاریخ پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں جن دو قوموں کی بات زور و شور کے ساتھ ہوئی وہ ماضی بعید سے اسی شکل میں دو جُدا دھاروں کی صورت میں چلتی چلی آئی ہیں۔ اس طرزِ فکر کا ناگزیر پہلو یہ تھا کہ ماضی کے وہ واقعات اور رجحانات جو مذہبی آویزش سے پراگندہ نہیں تھے اُن کو بھی مذہبی تقسیم کے انداز میں پیش کیا جائے۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ایسے واقعات کو زیرِ بحث لاتے وقت غیر مسلموں کے کردار سے یا تو یکسر صرفِ نظر کر لیا جائے یا پھر اس کو محض ایک غیر نمایاں اور غیر اہم کردار کے طور پر پیش کیا جائے۔ یہ رویہ کیونکہ غیر تاریخی ہے لہٰذا اس کی اصلاح کی ضرورت ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ اب ہمارے یہاں اس کمزوری کو محسوس کیا جانے لگا ہے اور تاریخ کو معروضی انداز میں دیکھنے کے رجحان نے کسی نہ کسی حد تک تقویت حاصل کی ہے۔

یہاں پاکستان کی تاریخ نویسی کی ایک اور بڑی کمزوری کی طرف اشارہ بھی ناموزوں نہیں ہوگا اور وہ کمزوری یہ ہے کہ صرف ۱۸۵۷ء ہی پر کیا موقوف، ہمارا سارا تاریخ نویسی کا بیانیہ برطانوی استعمار کے بنیادی موضوع کو نظرانداز کر دیتا ہے یا اس کا ذکر ایک ثانوی حقیقت کے طور پر اور وہ بھی اکثر و بیشتر واجبی انداز میں کیا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیابی کے بعد انگریزی استعمار نے ہندوستان پر پنجے گاڑھنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ یہ عمل سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور پھر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان سلطنتِ برطانیہ کی نوآبادی بنا رہا۔ گویا کوئی دو سو سال تک انگریزی استعمار ہندوستان کی معاشرت اور سیاست کی سب سے بڑی حقیقت تھا اور وہ سب رجحانات، سماجی رویے، سیاسی تصورات اور سیاسی تشکیلات جو ان دو سو سال میں ظہور پذیر ہوئیں وہ سب کی سب براہ راست طور پر اس نوآبادیاتی نظام کا شاخسانہ تھیں اور اس کے زیر اثر اُبھری تھیں۔ سوچا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستان ایک نوآبادی نہ بنا ہوتا تو کیا یہاں کسی کانگریس، کسی مسلم لیگ، کسی فیوڈل سیاسی اشرافیہ اور کسی چیمبر آف کامرس کا

قیام اسی صورت ممکن ہوتا جس طرح یہ سب تشکیلات اور واقعات انگریز کی آمد کے براہ راست نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوئے۔ اس گزارش کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ہم ہندوستان میں انیسویں اور بیسویں صدی میں جس سیاسی جدل اور جن رجحانات و واقعات کو موضوعِ بحث بناتے ہیں اُن کا حقیقی تناظر تو نوآبادیاتی نظام ہی تھا۔ اس تناظر کو صفحۂ یادداشت سے مٹا کر ہم محض سطحی تجزیوں ہی کے مکلّف ہو سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ہندوستانی بغاوت کی تعبیرات اور پاکستان کی تاریخ نویسی کے چند بنیادی مسائل کے محولہ بالا تذکرے کے بعد اب ہم اس بغاوت کے آغاز و انجام، اس کے تحت ہونے والے سلسلۂ واقعات، اس کے سماجی کردار اور اس کے سیاسی و سماجی نتائج کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

۱۸۵۷ء صرف برطانوی استعمار کے حتمی تسلط کا ہی سال نہیں ہے بلکہ اس سال جو پُر آشوب واقعات ہندوستان کے طول و عرض میں ظہور پذیر ہوئے انہوں نے اس استعمار کے خلاف ہندوستان کے ردِ عمل کو بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا۔ ان واقعات کا آغاز ۱۰ مئی کو میرٹھ میں تین رجمنٹوں کی بغاوت سے ہوا جنہوں نے ایک روز قبل اپنے ۸۵ سپاہی ساتھیوں کو کورٹ مارشل کے ذریعے ہونے والی ۱۰ سال کی سزا پر احتجاج کیا۔ انہوں نے قید خانے پر ہلّہ بول کر ان سپاہیوں کو رہا کروالیا۔ ان سپاہیوں پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے بندوقوں میں استعمال ہونے والی نئی وضع کے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کارتوسوں میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال کی جاتی ہے۔ گائے کی چربی پر ہندوؤں کا اعتراض تھا جبکہ سؤر کی چربی مسلمانوں کے لیے مکروہ اور حرام تھی۔ چونکہ ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے پہلے ان کو منہ سے کھولنا پڑتا تھا لہٰذا نہ تو ہندو اور نہ ہی مسلمان اس فعل کو قبول کر سکتے تھے۔ کارتوسوں کی یہ بات بہت معروف اور عام فہم بات ہے مگر جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی زاویے سے قطع نظر کارتوسوں کا قصہ اُس وقت ہندوستان میں پائے جانے والے انگریز مخالف جذبات کو محض چنگاری دکھانے کے واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بجائے خود کوئی اتنا بڑا واقعہ نہیں تھا جو پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ لگا سکتا۔ اور جیسا کہ بعد میں ہوا بھی کہ باغی سپاہیوں نے انہی کارتوسوں کو خود انگریز فوج کے خلاف استعمال کیا اور

ظاہر ہے کہ اس کا طریقۂ استعمال بھی وہ ہی رہا ہوگا جس طریقے پر وہ معترض تھے اور جس کی بنا پر وہ آمادۂ بغاوت ہوئے تھے۔ چنانچہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برٹش بنگال آرمی کے سپاہیوں نے جو بغاوت کی اُس کے مذکورہ بالا فوری سبب سے قطع نظر اصل محرکات کیا تھے اور یہ کہ یہ ایک ملک گیر اُبھار کس طرح بن گئی۔ آگے چل کر ہم اس موضوع پر بات کریں گے۔ یہاں ہمارے پیش نظر یہ دیکھنا ہے کہ اس بغاوت کی وسعت کیا تھی اور ہندوستان کے کون کون سے علاقے براہ راست طور پر اس کی زد میں آئے۔ اس بات کا تعین اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ یہ کسی ایک یا دوسرے علاقے تک محدود چھوٹا سا واقعہ نہیں ہے جس کو کہ تاریخ نویسوں نے سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا ہو۔ اس وقت کے انگریز حکمرانوں نے قابلِ فہم طور پر اس کو غدر قرار دیا اور جب کبھی اس کو بغاوت کہا بھی تب بھی اُن کا اشارہ محض بنگال کی فوج کی طرف ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بغاوت کی وسعت کو محدود کر کے دکھانا ہوتا تھا۔ لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پہلی بار اس بغاوت کو ایک ہمہ گیر اور ہندوستان گیر بغاوت قرار دینے بلکہ اس کو ایک قومی انقلاب کا نام دینے والے بھی خود انگلستان ہی کے عمائدین اور اہلِ دانش تھے۔ ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو یعنی اس بغاوت کے آغاز کے صرف دو مہینے بعد برطانیہ کی اس وقت کی حزبِ اختلاف کے ترجمان بنجمن ڈزرائلی (Benjamin Disraeli) نے ہاؤس آف کامنز کے سامنے ہندوستان کی صورتِ حال کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ نقطہ اختیار کیا کہ یہ جنگ محض ایک فوجی بغاوت نہیں ہے بلکہ یہ مظہر ہے اس گہرے عدم اطمینان کا جو ہندوستان کی پوری آبادی میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے وِس کاؤنٹ پالمرسٹن (Viscount Palmerston) کی حکومت پر شدید تنقید کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ 'کیا یہ ایک فوجی شورش ہے یا یہ ایک قومی انقلاب ہے؟... جو اقدامات ایک فوجی شورش سے نمٹنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں وہ ایک قومی بغاوت سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی ثابت نہیں ہو سکتے'۔[۳]

ڈزرائلی کا یہ تجزیہ غلط نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جنگل میں لگنے والی آگ کی مانند تھی جس نے چند ہی روز میں ایک پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہ شمالی ہند کے ایک ایسے وسیع رقبے پر پھیل گئی جس میں دہلی، اودھ، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ اور آگرہ پر مشتمل شمال مغربی صوبہ جات اور بہار کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔[۴] اس رقبے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے

لگایا جاسکتا ہے کہ یہ فرانس، آسٹریا اور پرشیا کے مجموعی رقبے کے برابر اور آبادی میں اس بھی زیادہ تھا۔[۵] یہی نہیں بلکہ پنجاب، سندھ اور سرحد تک اس کے اثرات پہنچے۔ مولانا غلام رسول مہر نے انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، لاہور، گجرانوالہ، سیالکوٹ، جہلم، ملتان اور پشاور میں بغاوت کی تفصیلات درج کی ہیں۔[۶]

بغاوت کی تفصیلات مرتب کرنے والوں نے اب اس کی تقریباً سب ہی جزیات کو محفوظ کرلیا ہے۔[۷] ۱۰ر مئی کو میرٹھ میں بغاوت شروع ہونے کے اگلے ہی دن باغی سپاہی دہلی پہنچ گئے اور بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ مغلیہ سلطنت اُس وقت تک ہندوستان کے تقریباً سب ہی علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور بہادر شاہ ظفر کا اقتدار دہلی کے قلعے تک محدود تھا۔ اُن کی بادشاہت کا اعلان ان معنوں میں اہم تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی ایک علامتی حیثیت تھی اور وہ ہندوستان کی وحدت اور اقتدارِ اعلیٰ کی علامت بن سکتے تھے۔ یہی مقصد تھا جس کے پیش نظر باغیوں نے اُن کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ مئی کے اواخر تک بغاوت کی چنگاریاں علی گڑھ، فیروز پور، مارتھ پور، لکھنؤ، بریلی اور شاہ جہاں پور تک پہنچ گئیں۔ جون کے پہلے ہفتے میں مراد آباد، بدایوں، اعظم گڑھ، سیتاپور، بنارس، کانپور اور جھانسی نے بغاوت کے مناظر دیکھے۔ ۶ جون کو نانا صاحب نے کانپور کا محاصرہ کرلیا۔ ۷ر اور ۸ جون کو باغیوں نے جھانسی پر قبضہ کیا اور رانی لکشمی بائی کی حکمرانی کا اعلان کردیا۔ ۹ر اور ۱۳ر جون کے درمیان فتح پور، نواگنج، گوالیار اور فتح گڑھ میں بغاوت ہوئی۔ جون کے اواخر تک کانپور پر نانا صاحب کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ جولائی میں اندور میں بغاوت ہوئی اور لکھنؤ کی ریزیڈنسی باغیوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس بغاوت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ کامیابیاں اور ناکامیاں دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، کسی علاقے میں باغیوں کو کامیابی ہوتی تو عین اُسی وقت کسی دوسرے علاقے میں وہاں کے باغی ناکامی کا سامنا کررہے ہوتے یا اُن کی ابتدائی کامیابی ناکامی میں بدل رہی ہوتی۔ چنانچہ جولائی ہی میں نانا صاحب کو فتح گڑھ اور کانپور میں بھی پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگست میں تانتیا توپے کو بتھور میں ناکامی ہوئی۔ ۱۷ر اگست کو سر کولن کیمبل نے فوج کی کمان سنبھالی۔ اگلے مہینے باغیوں کو اور بھی کئی جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور سے ۱۴ر ستمبر کو برطانوی فوج نے کشمیری گیٹ کو بم سے اُڑا دیا اور ۱۹ر اگست کو لاہوری گیٹ بھی اڑا دیا گیا۔ ۲۰ ستمبر تک دہلی پر دوبارہ انگریز کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر

نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی اور بعد میں وہ گرفتار ہوگئے۔ ان کے شاہزادے بھی گرفتار ہوئے اور بعد میں انہیں میجر ہڈسن نے قتل کر دیا۔ اکتوبر میں لکھنؤ بھی واپس انگریزوں کو مل گیا۔ اکتوبر ہی میں تانتیا توپے نے کانپور میں انگریزوں کو شکست دی مگر دو ماہ بعد کولن کیمبل کے ہاتھوں اُس کو بھی شکست ہوئی۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ مکمل طور پر برطانوی کنٹرول میں آ گیا۔ اگلے ماہ برطانوی فوجوں نے جھانسی پر حملہ کیا اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ رانی لکشمی بائی وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئی۔ ایک اور باغی کمانڈر کنور سنگھ جس نے اعظم گڑھ اور جگدیش پور میں انگریزوں کو ہرایا تھا ۲۶ر اپریل کو مارا گیا۔ ایک اور باغی لیڈر بہادر خان جس نے دہلی میں علم بغاوت بلند کیا تھا مئی میں اُس کو بھی شکست ہوئی۔ جون میں رانی جھانسی ماری گئی۔ رانی جھانسی گوالیار میں لڑتے ہوئے ماری گئی۔ تانتیا توپے بھی جواب تک کبھی اِدھر کبھی اُدھر انگریز سے نبرد آزما تھا۔ بالآخر پکڑا گیا اور اُسے پھانسی دے دی گئی۔

بغاوت کے دنوں میں جہاں جہاں برطانوی کنٹرول بحال ہوتا جاتا تھا وہاں بغاوت کو مکمل طور پر کچل دینے کے بعد برطانوی سپاہ کی طرف سے ظلم و جبر کا بازار گرم کر دیا جاتا تھا۔ لوگوں کو گروہ در گروہ قتل کیا گیا۔ باغیوں، ان کے ہمدردوں یہاں تک کہ ایسے عام لوگوں کو جن کے بارے میں انگریز کو شک ہوتا تھا کہ انہوں نے باغیوں کا ساتھ دیا ہے اُن سب کو پھانسی دے دی جاتی تھی اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو درختوں کی ٹہنیوں پہ باندھ کر پھانسی دی گئی۔ گھر اور بازار الگ سے جلائے گئے۔ شاہی خاندان کی بیگمات کی تضحیک کی گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے 'بیگمات کے آنسو' میں بغاوت کے اس پہلو کی بہت دلدوز تصویریں پیش کی ہیں۔[۸] خود غالبؔ کے خطوط میں بغاوت کے دنوں کے دہلی کے بڑے بھیانک مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں۔

بغاوت کی وسعت کا اندازہ اس بھی کیا جا سکتا ہے کہ انگریز کی باقاعدہ فوج (ریگولر آرمی) کی ہر رجمنٹ نے اور غیر مستقل (irregular) فوج کی ۱۸ر میں سے ۱۰ر رجمنٹوں اور پیادہ فوج (cavalry) کی ۷۴ میں سے ۶۳ رجمنٹیں قطعاً باغی ہوگئیں اور ڈیوٹی سے غائب ہوگئیں۔ یہ بات بھی اہم اور قابلِ غور ہے کہ فوجیوں کی طرف سے شروع کی گئی بغاوت کا براہ راست تعلق تو ان کی بیرکوں اور ان علاقوں سے تھا جہاں یہ فوج تعینات تھی مگر بغاوت کی آگ پھیلتے ہی دوسرے علاقے اور غیر فوجی حلقے بھی اس کا حصہ بنتے چلے گئے۔ ماضی میں انگریز کو

ہندوستان میں جو مزاحمت دیکھنی پڑی تھی وہ ٹکڑیوں میں اور ایک دوسرے سے الگ اور غیر مربوط انداز میں ہوتی تھی بلکہ انگریز کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ تھا کہ اُس نے پورے ہندوستان میں ایک ساتھ محاذ کھولنے کے بجائے ایک ایک کر کے مختلف علاقوں پر قبضہ کیا تا کہ یہ علاقے مل کر زیادہ بڑی قوت کے ساتھ اُس کے مقابل نہ آ سکیں۔ خود ان علاقوں کے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور اکثر صورتوں میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے والے حکمرانوں نے بھی الگ الگ ہی انگریز کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بنگال ہو یا کرناٹک، مرہٹہ ہوں یا پنجاب اور سندھ کے حکمران، یہ سب الگ الگ ہی انگریز سے لڑے اور ظاہر ہے کہ ناکام رہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ریاست کے حکمرانوں نے کسی دوسری ریاست پر انگریز کی چڑھائی کے موقع پر انگریز کا حلیف بننا پسند کیا۔ ۱۸۵۷ء کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار مختلف ریاستوں کے درمیان اتحاد اور تعاون قائم ہوا۔ کچھ ریاستوں نے انگریز کا بھی ساتھ دیا مگر جو ریاستیں انگریز کے خلاف نبرد آزما ہوئیں انہوں نے کوشش کی کہ آپس میں تعاون کریں۔ اس باہمی اشتراک کی فضا نے جو گو کہ کچھ ہی عرصے تک قائم رہی اور بغاوت کی ناکامی پر ختم بھی ہوگئی، ہندوستان میں ایک متحدہ اُبھار کے ابتدائی نقوش اُجاگر کیے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ، چند بیرکوں میں ہونے والی شورش سے ایک وسیع بغاوت میں کس طرح تبدیل ہوئی اور اس کا دائرہ کار سپاہیوں سے بڑھ کر معاشرے کے مختلف شعبوں تک کس طرح پھیل گیا، اس کے لیے ہم کو اس بغاوت کے سماجی پس منظر کو سمجھنا ہوگا۔ خاص طور سے ہمیں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی اور سیاسی ریشہ دوانیوں پر نظر ڈالنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کمپنی کی پالیسیوں نے ہندوستانی معاشرے پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا پہلا چارٹر ۱۶۰۰ء میں ملا تھا۔ آئندہ برسوں میں اس نے ہندوستان میں رفتہ رفتہ اپنے قدم جمائے۔ سترہویں صدی میں کمپنی نے ہندوستان میں اپنے تجارتی ڈپو قائم کیے خاص طور سے سورت میں ۱۶۱۲ء میں اور مدراس میں ۱۶۳۹ء میں کمپنی کے ڈپو قائم ہوئے۔ ۱۶۶۹ء میں بمبئی لیز پر کمپنی کو دے دیا گیا۔ اس اہم اقدام کے بعد فورٹ ولیئم، کلکتہ میں ۱۶۹۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کاروباری مرکز قائم ہوا۔ اسی زمانے میں کمپنی نے مقامی ریاستوں کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس ضمن میں دو چیزوں نے

اس کی مدد کی۔ ایک تو مغل مرکز کی بتدریج کمزوری نے مقامی حکمرانوں کو اپنی خودمختار اور آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب کر دیا تھا۔ یہ خودمختار ریاستیں اکثر آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ اس باہمی آویزش نے کمپنی کو اپنا راستہ نکالنے اور بین الریاستی جھگڑوں کو ہوا دے کر مطلب براری کا موقع فراہم کر دیا۔ کمپنی ایک ریاست کے حکمران کی طرفداری کرتے ہوئے دوسری ریاست پر چڑھائی کرواتی اور بدلے ہوئے حالات میں اپنی پچھلی حلیف ریاست کے خلاف صف آرا ہونے میں بھی اس کو دیر نہیں لگتی۔ دوسری اہم چیز جس نے کمپنی کو طاقتور بنایا وہ یہ حقیقت تھی کہ اس نے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانے کے نام پر اپنی فوج بنالی۔ پلاسی کی جنگ نے اس کو ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک علاقے پر قابض کیا اور یوں کمپنی کی علاقائی طاقت جو بجائے خود اس کی عسکری طاقت کا نتیجہ تھی اس کی آئندہ پیش قدمیوں کا وسیلہ بنی۔ کمپنی کی اقتصادی پیش قدمیوں نے مقامی معیشت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ مغل مرکزیت کا خاتمہ سماجی و اقتصادی اعتبار سے بھی ایک معنویت رکھتا تھا۔ رجنی پام دت کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی داخلی جنگیں بجائے خود اس حقیقت کی مظہر تھیں کہ ہندوستان کا سابق سماجی دروبست اور نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا جس کو بالآخر ایک نئے نظام کا پیش خیمہ بننا تھا۔ یہ نیا نظام ہندوستان میں بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں، جہاز رانی اور نئے صنعتی مفادات کے گرد استوار ہونا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ نوخیز سرمایہ دارانہ رشتے محکم ہوتے اور ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی ٹھوس بنیاد پڑتی، برطانوی سرمایہ دارانہ مفادات جن کو ایک زیادہ ترقی یافتہ تکنیکی اور عسکری طاقت اور سماجی و سیاسی ارتباط کی پشت پناہی حاصل تھی، ہندوستان پر غالب آ گئے اور انہوں نے خود کو ایک پرانے معاشرے پر مسلط کر دیا۔[9]

برطانوی استعماری نظام میں بنگال کے انجذاب سے لے کر اٹھارویں صدی کے اواخر تک کمپنی کا مطمحِ نظر بنیادی طور پر یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے اور ہندوستان کے ایک زرخیز خطے پر اپنے تصرف سے بھرپور فائدہ حاصل کیا جائے۔ بنگال پر مکمل قبضے سے کمپنی کو جو تقویت حاصل ہوئی اُس نے اس کو اس لائق بنا دیا کہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ اشیاء خرید سکے۔ صورت حال یہ تھی کہ کمپنی سے وابستہ تاجر، کسانوں اور کاریگروں پر حکم چلاتے تھے اور اپنی مرضی کی شرائط پر اُن سے اجناس اور مصنوعات حاصل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی ادا کردہ رقم اجناس اور مصنوعات کی اصل قدر کے ایک چوتھائی تک بھی چلی جاتی تھی۔

دوسرے لفظوں میں تجارت اور لوٹ مار کا فرق ختم ہوگیا تھا۔ اس لوٹ مار کی بہترین توثیق برطانوی پارلیمنٹ کے رکن سرجارج کارنی وال لوئیس (Sir George Cornewall Lewis) کے بیان سے ہوتی ہے جنہوں نے ۱۲ر فروری ۱۸۵۸ء میں پارلیمان میں یہ بیان دیا کہ 'صفحۂ ہستی پر آج تک کوئی ایسی مہذب حکومت نہیں گزری جو اتنی بدعنوان، نمک حرام اور حریص واقع ہوئی ہو جتنی کے ۱۷۶۵ء اور ۱۷۸۴ء کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ثابت ہوئی'۔[۱۰]

لوٹ مار کا یہ عمل اس وقت ایک منظم نظام یا ایک باقاعدہ ادارے کے طور پر متشکل (institutionalised) ہوگیا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۷۶۵ء میں بنگال کی سول انتظامیہ یا دیوانی کا اختیار سونپ دیا گیا۔ مالیات کے نظم ونسق نے کمپنی کو لامتناہی لوٹ مار اور غبن کا موقع فراہم کردیا کیونکہ اب وہ اس لوٹ مار اور تاراجی کے لیے انتظامی ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے اور ہیر پھیر کی پوزیشن میں آچکی تھی۔ بنگال کی اس تاخت وتاراج کا اچھا خاصا ماتم خود برطانیہ کے دارالعوام میں بھی کیا گیا اور بعض باضمیر انگریزوں نے اس پر خوب خوب لعن طعن کی۔

اٹھارویں صدی میں برطانوی معیشت میں ایک اہم قلبِ ماہیت یہ ہوئی کہ تجارتی سرمایہ بڑی تیزی کے ساتھ صنعتی سرمائے میں تبدیل ہوا۔ صنعتی انقلاب کی طرف تیز رفتار پیش رفت کے لیے انگلستان کو جس ارتکازِ سرمایہ کی ضرورت تھی اُس کو ہندوستان سے آنے والی دولت نے پورا کیا۔[۱۱] مگر تصویر کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ خود ہندوستان کی اقتصادی صورتِ حال زبوں حالی کا شکار ہوگئی۔ ہندوستانی معیشت اور وسائل کی لوٹ مار نے آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو بے روزگاری اور انتہائی افلاس سے دوچار کردیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی استحصالی پالیسیوں نے ہندوستانی معیشت کو تقریباً برباد کرکے رکھ دیا۔ روایتی بندوبستِ اراضی ختم کردیا گیا۔ مقامی چھوٹی صنعت اور دستکاری ختم ہوگئی، ہندوستانی تجارت پیشہ طبقہ اپنی خودمختاری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ روایتی معیشت کی اس تباہی نے تمام ہی مقامی طبقوں کو مختلف درجوں میں متاثر کیا جس کے نتیجے میں بے چارگی اور مایوسی کی فضا عام ہوئی اور ایک بھرپور سماجی اُبھار کے اسباب پیدا ہوگئے۔

۱۷۷۰ء میں بنگال میں حالات اُس وقت مزید دگرگوں ہوگئے جب قحط کا دور دورہ ہوا۔ اس قحط کے نتیجے میں تقریباً ایک کروڑ افراد لقمہ اجل بنے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس قحط کے دوران زمین سے حاصل ہونے والے محصولات میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا کیونکہ کمپنی نے

محصولات کے حصول کے لیے انتہائی ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے۔[12]

جیسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی قبضہ گیری کی پالیسی بنگال سے آگے بڑھ کر دوسرے علاقوں تک پہنچتی رہی، ویسے ویسے اس کا استحصال کا عمل بھی ترقی پاتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ رویں صدی کے وسط تک ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ اس کے قبضے میں آ چکا تھا۔ گو بنگال سب سے پہلے انگریزی استبداد کا شکار ہوا اور سب سے پہلے تباہی اور تاراجی بھی اسی کی ہوئی مگر بعد میں انگریزی قبضے میں آنے والے علاقوں میں جس پیمانے پر استحصال کیا گیا وہ بنگال سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ مثلاً شمالی ہندوستان میں جو مہلواری نظام متعارف کیا گیا اور جس میں محصولات کی شرح میں مستقلاً اضافے کرتے رہنے کی گنجائش رکھی گئی، وہ بنگال اور بہار میں متعارف کیے جانے والے مستقل بندوبستِ اراضی سے کہیں زیادہ سخت گیر نظام ثابت ہوا۔ ۱۹ رویں صدی کے نصف اوّل میں، محصولات میں ۷۰ فیصد تک اضافہ ہوا۔ یہی نہیں بلکہ محصولات کے لیے اختیار کردہ یکطرفہ اور سخت گیر طریقوں کے نتیجے میں بڑی تعداد میں زمیندار اور کاشتکار زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ استحصال کے اس تناظر میں یہ بات حیرت کا باعث نہیں ہونی چاہیے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت بنگال کی فوج میں کیوں ہوئی جس کے سپاہیوں کی اکثریت کی بھرتی آج کے یوپی کے مختلف علاقوں اور ہریانہ اور بہار سے ہوئی تھی۔ یہ سپاہی زرعی طبقات سے تعلقات رکھتے تھے اور یہی طبقات ایسٹ انڈیا کمپنی کی استحصالی پالیسیوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔[13] یہی حقیقت اس امر کی بھی وضاحت کر دیتی ہے کہ فوج کے بیرکوں میں ہونے والی بغاوت، محض ایک فوجی بغاوت ہی کیوں نہیں بن کر رہ گئی اور آناً فاناً اس نے عوام کی حمایت اور پشت پناہی کیوں حاصل کر لی۔ فوجیوں کا ساتھ دینے والوں میں یہ زرعی طبقات سب سے آگے تھے۔ ان طبقات میں عام کسان اور زمیندار دونوں شامل تھے۔

بغاوت کا یہ سماجی اور کثیر الطبقاتی پس منظر ہی تھا جس نے لوگوں کے باہمی مذہبی اختلافات کو پس پشت ڈال دیا اور ہندو اور مسلمان دونوں ایک مشترکہ مقصد کے لیے یکجا ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے اپنی تنظیم کاری میں اس پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رکھا تھا کہ سپاہیوں میں بہت زیادہ تعلق باہمی پیدا نہ ہو۔ ہر رجمنٹ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح ان میں ثقافتی طور پر فاصلے برقرار رہیں گے۔